عہد فیروز شاہی کا نظام محاصل

(شرعی قوانین کی روشنی میں)

جناب ظفر الاسلام ایم اے

ہندوستان کے مسلم سلاطین وملوک کی بابت یہ کہنا تو خلاف واقعہ ہوگا کہ وہ اسلام کے نمائندے، اوامر ونواہی کے پوری طرح پابند اور ریاست وحکومت کے دائرے میں اسلامی قوانین پر مکمل طور سے عمل پیرا تھے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے یہاں عام طور پر شریعت کا احترام اور شرعی قوانین کا پاس ولحاظ پایا جاتا تھا۔ ان کی شخصی وعوامی زندگی گو صحیح معنوں میں ایک مسلم فرماں روا کی زندگی کی عکاس نہ تھی لیکن اسلامی اقدار کے فروغ اور اسلامی تہذیب وتمدن کی ترقی کے لئے انھوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر جو خدمات انجام دیں انھیں نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا، بالخصوص ان سلاطین کا عہد حکومت کافی اہم اور قابل قدر ہے جن کے بارے میں تاریخی شواہد سے یہ ثابت ہے کہ انھوں نے اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے، غیر اسلامی رسوم ورواج کو مٹانے اور نظم ونسق وشریعت میں مطابقت پیدا کرنے کی نمایاں کوشش کی۔ اس نقطۂ نظر سے دہلی عہد سلطنت (۱۲۰۶-۱۵۲۶) کا جائزہ لیا جائے تو فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱ - ۱۳۸۸) کا نام سرفہرست نظر آتا ہے۔

سلاطین دہلی میں فیروز شاہ کی شخصیت اس لحاظ سے سب سے زیادہ نمایاں ہے کہ وہ صرف شخصی زندگی میں مذہب کے احترام اور مذہبی تقاضوں کی تکمیل کا قائل نہ تھا بلکہ سیاست وحکومت کے مختلف شعبہ جات میں بھی وہ شرعی قوانین کو نافذ العمل دیکھنا چاہتا تھا، مشہور معاصر مورخ برنی کے خیال میں مسلمانوں کے حقوق کی ادائیگی اور احکام شرعی کے نفاذ میں فیروز شاہ ایک بے مثال سلطان تھا[1] اور اسی دور کے دوسرے مورخ شمس سراج عفیف نے اسی حقیقت کا اعتراف

---

[1] ضیاء الدین برنی کے اپنے الفاظ میں "نوشتہ است و می نویسد من ہیچ سلطان العہد والزماں فیروز شاہ سلطان
(اگلے صفحہ پر)

اس انداز میں کیا ہے کہ فیروز شاہ نے شریعت کو رہنما بناتے ہوئے مشروعات کو نافذ کرنے اور غیر مشروعات کو ختم کرنے کے لئے عملی اقدام کئے[1] خود فیروز شاہ نے اپنے رسالے "فتوحات فیروز شاہی"[3] میں اپنے عہد کے کارناموں میں سب سے زیادہ اس پہلو کو نمایاں کیا ہے کہ نظم و نسق کے مختلف شعبوں میں شریعت کے خلاف جو آئین و دستور رائج تھے ان کو ختم کر کے اسلامی قوانین نافذ کئے گئے، ملحدانہ تحریکات کا سد باب کیا گیا اور مخرب اخلاق رسوم و رواج پر پابندی عائد کی گئی تاکہ اسلامی روایات کو فروغ حاصل ہو اور مذہبی و اخلاقی قدروں کی جڑیں مضبوط ہوں۔ مزید براں مذہبی علوم و فنون بالخصوص فقہ اسلامی کی نشر و اشاعت کے لئے فیروز شاہ نے جو کارنامے انجام دیئے[4] وہ خود شرعی قوانین کے نفاذ کے لئے اس کی سنجیدہ کوششوں کا حصہ تھے۔

شرعی قوانین کی روشنی میں فیروز شاہ نے نظم و نسق کے مختلف شعبوں میں جو اصلاحات کیں اس کا سب سے زیادہ اثر شعبہ محاصل پر مترتب ہوا نظام محاصل میں فیروز شاہ کی اصلاحات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :۔

در اعطاء حقوق مسلمانان و اتمام احکام شرع محمدی بادشاہی دیگر ندیدہ ام" (تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ ۱۸۶۲ء صـ۵۶۱ نیز دیکھئے صـ۵۴۸) [2] شمس سراج عفیف تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ۱۸۹۱ء، صـ۹۸، ۹۹، ۲۷۳ [3] "فتوحات فیروز شاہی فیروز تغلق" فیروز شاہ کے کارناموں کا ایک مختصر و جامع ریکارڈ ہے جسے خود سلطان نے مرتب کیا تھا، اصلاً اس کا پورا متن عام اشتہار کے لئے "مسجد خاص" کے منارہ پر کندہ کیا گیا تھا بعد میں اسے ایک رسالہ کی صورت میں محفوظ کیا گیا، یہ رسالہ پروفیسر عبدالرشید کی تصحیح کے ساتھ شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے ۱۹۵۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔ [4] فیروز شاہ بذات خود فقہی علوم کا ماہر تھا اور ان کی ترویج و ترقی میں بھی اس نے غیر معمولی دلچسپی دکھائی اس کے عہد میں فقہ کی متعدد تالیفات وجود میں آئیں، ان میں اہم و قابل ذکر فتاوائے تاتارخانی اور فتاوائے فیروز شاہی ہیں۔ (عفیف، صـ۱۶۹، ۳۹۲، برنی، صـ۵۶۲ تا ۵۵۹، ۵۶۳، تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے ریاست علی خاں ندوی "کچھ فتاوائے تاتارخانی کے بارے میں"، معارف (اعظم گڑھ) جلد ۵۹، شمارہ ۳، ۱۹۴۷ء، صـ۱۶۵-۱۸۰ اور راقم السطور کا مضمون "فتاوائے فیروز شاہی اور عصری مسائل" برہان (دہلی) جلد ۹۱، شمارہ ۱-۲ جولائی و اگست ۱۹۸۲ء، صـ۲۱-۳۶، ۴۰-۲۲،

(الف) شریعت کے متعینہ محاصل کا نفاذ اور ان کی تحدید و تحصیل میں شرعی اصول و ضوابط کی پابندی۔

(ب) پہلے سے رائج غیر شرعی محاصل کی ممانعت اور علماء کے مشورے سے بعض نئے محاصل کا اضافہ۔

فتوحات فیروز شاہی اور سیرت فیروز شاہی[1] دونوں کے بیانات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ فیروز شاہ نے عمال (محصلین) اور دیگر افسران شعبہ کے نام یہ عام حکم جاری کیا تھا کہ بیت المال میں صرف انھیں محاصل کی آمدنی داخل کی جائے جن کی شریعت نے اجازت دی ہے اور ان محاصل کو قطعاً بیت المال کی آمدنی کا ذریعہ نہ بنایا جائے جو شریعت سے ثابت نہیں ہیں۔ ان مآخذ میں شریعت کے متعینہ محاصل میں زکوٰۃ، خراج، جزیہ، خمس غنائم و معادن، عشور و ترکات (غیر موروثہ) کو شامل کیا گیا ہے[2]

اس میں شبہ نہیں کہ فیروز شاہ سے قبل دیگر سلاطین کے دور میں ان میں سے اکثر محاصل کا ذکر ملتا ہے لیکن سلطان کی جانب سے شریعت کی روشنی میں حکومت کے ذرائع آمدنی کا تعین اور اس کے نفاذ پر زور پہلی بار فیروز شاہ کے عہد میں نظر آتا ہے۔ ان محاصل میں سے جن کی تشخیص و تحصیل سے متعلق فیروز شاہ کے ضوابط یا اصلاحی اقدامات معاصر

---

[1] سیرت فیروز شاہی عہد فیروز شاہی کے اہم تاریخی ماخذوں میں سے ہے۔ اس کے مصنف غیر معروف ہیں لیکن دیباچہ میں مصنف نے بغیر نام ظاہر کئے یہ صراحت کی ہے کہ خود سلطان نے اس کتاب کا املا کرایا تھا۔ فیروز شاہ کے دور کے سیاسی و تمدنی کارناموں پر روشنی ڈالنے کے علاوہ یہ کتاب شرعی قوانین کے نفاذ کے لئے سلطان کی کوششوں کا مفصل جائزہ بھی پیش کرتی ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور (پٹنہ) میں محفوظ ہے اور اسی کی ایک نقل مولانا آزاد لائبریری (یونیورسٹی کلکشن، فارسیہ اخبار، ۱۱۱) مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں دستیاب ہے۔ [2] فتوحات فیروز شاہی، محولہ بالا ص ۶ سیرت فیروز شاہی، محولہ بالا ص ۱۲۴، موخر الذکر ماخذ میں ذرائع آمدنی میں شریعت کی پابندی کے ساتھ مصارف میں بھی شرعی اصول پر عمل کی ہدایت کا ذکر ہے۔

تاریخوں میں مذکور ہیں وہ ہیں خراج، مالِ غنیمت میں بیت المال کا حصہ اور جزیہ۔

اس دور میں خراج کی تشخیص یا اس کی مقدار کی تعیین کے دو طریقے رائج تھے۔ ایک تھا اصل پیداوار سے حکومت کے متعینہ حصہ کو الگ کر لینا اور دوسرا زمین کی پیدائش اور اس کی پیداوار کے تخمینہ کی روشنی میں حکومت کے مطالبہ کی تعیین[1] فیروز شاہ کے دور میں ان میں سے کون سا طریقہ معمول بہ تھا اس کے بارے میں معاصر مورخین کے بیانات سے دو متضاد صورتیں سامنے آتی ہیں۔ برنی نے پہلے طریقہ کے اختیار کرنے کا ذکر کیا ہے[2]۔ جب کہ عفیف کے بیان سے دوسرے طریقہ پر عمل درآمد ظاہر ہوتا ہے[3]۔ لیکن اگر کسانوں (مزارعان) کے تئیں فیروز شاہ کی عام پالیسی (ان کی آسودگی و خوش حالی کے لئے کوشش[4]) کو مدنظر رکھا جائے تو برنی کا بیان زیادہ قابلِ اعتبار معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ اصل پیداوار کے مطابق خراج کی تحصیل میں کسانوں کی بہبود کے پہلو زیادہ نمایاں ہیں، بہرحال طریقۂ تشخیص سے متعلق اس اختلافی بیان کے باوجود مورخین کا عام طور پر اس پر اتفاق ہے کہ فیروز شاہ نے خراج کی تعیین میں محض قیاس آرائی پر اعتماد کرنے حکومت کے متعینہ مطالبے سے تجاوز کرنے اور اس طرح کی دیگر بے ضابطگیوں کو ممنوع قرار دیا تھا جو سابق دور میں پائی جاتی تھیں[5]۔ جہاں تک خراج کے تحت وصول کی جانے والی پیداوار یا نقد رقم کی مقدار کا تعلق ہے اس کی صراحت نہیں ملتی، البتہ فیروز شاہ کا یہ عام اصول تاریخی ماخذ سے ثابت ہے کہ کاشتکار پر خراج کی وہ مقدار عائد کی جائے جسے[6]

---

[1] فقہ کی اصطلاح میں پہلے کو "خراج مقاسمہ" اور دوسرے کو 'خراج موظف' کہا جاتا ہے [2] برنی ص۵۷۴ [3] عفیف، ص۹۴ [4] مثال کے طور پر سلطان کی جانب سے تقاوی کی سابق رقموں (جو کسانوں پر واجب الادا تھیں) کو معاف کرنا (عفیف ص۹۲) آبپاشی کی سہولتیں بہم پہونچانا اور خود ان سے متعلق بہت سے غیر شرعی محاصل پر پابندی عائد کرنا (موخر الذکر دونوں مثالوں کی تفصیلات آگے آرہی ہیں) [5] برنی، ص۵۷۴، عفیف نے یہ شہادت پیش کی ہے کہ فیروز شاہ نے خراج کی تشخیص کے لئے خواجہ حسام الدین جنید کو مقرر کیا تھا انھوں نے چھ سال تک ملک کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا اور اپنے جائزے کی روشنی میں اس کام کو انجام دیا (تاریخ فیروز شاہی، ص۹۴)

بلا کسی مشقت و پریشانی کے ادا کر سکیں[1] اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خراج کی یکساں مقدار تمام علاقوں پر لاگو نہ تھی بلکہ زمین کی زرخیزی اور کاشتکار کے حالات کے مطابق اس کا تعین ہوتا تھا۔ ویسے فیروز شاہ کے ماقبل دور میں پیداوار کا پانچواں حصہ خراج کا عام معیار تھا، زیادہ قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ کے دور میں یہ عام معیار باقی رہا ہوگا اور بعض مخصوص حالات میں اس میں کمی و بیشی عمل میں آئی ہوگی۔

شرعی قانون کے مطابق مالِ غنیمت کا ۴/۵ حصہ شرکارِ جنگ کا حق ہوتا ہے اور بیت المال صرف ۱/۵ (خمس) کا حقدار ہوتا ہے، لیکن فیروز شاہ کے بیان سے یہ صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے عہد سے پہلے اس شرعی تناسب کے برخلاف مالِ غنیمت کا ۴/۵ حصہ بیت المال کے لئے مخصوص کر لیا جاتا تھا اور غانمین میں صرف ۱/۵ تقسیم کیا جاتا تھا[2] شرعی قانون کی یہ خلاف ورزی کس سلطان کے دور میں شروع ہوئی اس کی وضاحت نہیں ملتی۔ البتہ کم از کم سلطان التتمش (۱۲۱۰ - ۱۲۳۵) کی بابت یہ تاریخی ثبوت موجود ہے کہ اس کے دور میں مالِ غنیمت کی تقسیم میں شرعی تناسب برقرار رہا[3] بہرحال فیروز شاہ نے اس غیر شرعی تقسیم کی ممانعت کی اور یہ حکم جاری کیا کہ غنائم کا ۱/۵ حصہ بیت المال میں داخل کیا جائے اور باقی ۴/۵ غانمین کو دیا جائے[4] اس حکم پر عمل درآمد کی مزید تاکید جاج نگر کی مہم میں کامیابی

---

[1] برنی نے ان الفاظ میں اپنے تاثرات کو بیان کیا ہے "واز محصول معاملتی کہ رعایا از دل و جان بے کراہتی و مشقتی و شدتی ادا نمائند کفایت کردند و مزارعان کہ خازنان بیت المال مسلمانان اند عنفی و خشونتی در میان نیاوردند" (تاریخ فیروز شاہی) نیز دیکھئے عین الدین ماہرو، انشاء ماہرو، (تصحیح پروفیسر شیخ عبدالرشید) لاہور ۱۹۶۵ء، مکتوب ۳۰ ص ۷، [2] فتوحات فیروز شاہی، ص ۶ [3] سلطان التتمش کے ہم عصر مورخ اور اس دور کے مشہور فقیہ قاضی منہاج السراج نے ذکر کیا ہے کہ سلطان التتمش کے عہد میں کالنجر کی فتح کے بعد جو مال غنیمت حاصل ہوا، اس کا پانچواں حصہ سلطنت کے خزانہ میں داخل کیا گیا (طبقات ناصری تصحیح عبدالحی حبیبی کابل ۱۹۶۴ء جلد دوم ص ۶۲) [4] فتوحات فیروز شاہی [5] سیرت فیروز شاہی، ص ۱۲۵-۱۲۶، شیخ نور الحق، زبدۃ التواریخ، روٹو گراف (مخطوطہ برٹش میوزیم) ۱۸۰ ریسرچ لائبریری، شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ورق ۶۴ الف

کے بعد اس ہدایت میں ملتی ہے "چوں غنائم بر بلادِ اسلام برسد بحکم خدا بر شریعت مصطفیٰ قسمت شود"[۱] (جب مالِ غنیمت بلادِ اسلام میں پہنچے تو حکم خداوندی اور شریعت مصطفوی کے مطابق اس کی تقسیم کی جائے)

اسلام کے نظام محاصل میں جزیہ اس ٹیکس کو کہتے ہیں جو ذمیوں سے انھیں فوجی خدمت سے مستثنیٰ رکھنے کے سبب اور ان کی جان و مال کے تحفظ کے عوض وصول کیا جائے۔ اسلامی قانون کے اعتبار سے یہ ٹیکس صرف انھیں ذمیوں پر عائد کیا جائے گا جو فوجی خدمت کے قابل ہوں اور ادائیگی کی وسعت رکھتے ہوں اور اس کی شرح ادائیگی ذمیوں کی مالی حالت کے اعتبار سے مختلف ہوگی۔[۲] ہندوستان میں قانون جزیہ کا نفاذ سب سے پہلے محمد بن قاسم کے دور میں شروع ہوا۔ اس نے سندھ کی فتح کے بعد وہاں کے ہندوؤں کو ذمی کی حیثیت سے تسلیم کیا اور جزیہ کی عام شرح کے مطابق امیر، متوسط اور ادنیٰ طبقہ پر بالترتیب ۴۸، ۲۴ اور ۱۲ درہم عائد کئے[۳] لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت کے قیام کے بعد اس ٹیکس اور اس کی تحصیل کے طریقوں کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ مزید برآں بعض تاریخی ماخذ میں لفظ "جزیہ" عام ٹیکس، خراج[۴] یا باج[۵] کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے جس کی وجہ سے اس کی نوعیت غیر واضح ہو کر رہ گئی ہے۔ تاہم فیروز شاہ کے دور میں اس محصول سے متعلق جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس نے اسلامی قانون کے مطابق

---

[۱] انشاء ماہرو، محولہ بالا مکتوب ۵۲، ص ۱۲۳ - ۱۲۴
[۲] جزیہ سے مستثنیٰ لوگوں کے زمرہ میں عورتیں، بچے، اندھے، اپاہج، ناکارہ، بوڑھے، نادار و مساکین، معابد کے خدام اور رہبان شامل ہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: ابو یوسف، کتاب الخراج، مطبعہ امیریہ مصر ۱۳۰۲ھ، ص ۷۰؛ ابو الحسن علی الماوردی، الاحکام السلطانیہ، مصر ۱۹۰۹ء، ص ۱۲۱-۱۲۰؛ برہان الدین علی المرغینانی، الہدایہ، لکھنؤ ۱۲۲۵ھ، جلد ثانی ص ۴۰۲۔
[۳] محمد علی کوفی، چچ نامہ (انگریزی ترجمہ قلیچ بیگ) ادارہ ادبیات دلی ۱۹۷۹ء، ص ۱۶۵-۱۶۴۔
[۴] عبد الحمید محرر غزنوی، دستور الالباب فی علم الحساب، روٹوگراف مخطوطہ رضا لائبریری رامپور، عدد ۱۷۵، ریسرچ لائبریری، شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ورق ۲۵ الف؛ امیر حسن سجزی، فوائد الفواد، نولکشور ۱۳۰۲ھ، ص ۱۲۵-۱۲۰۔
[۵] امیر خسرو، قران السعدین، علی گڑھ ۱۹۱۸ء، ص ۲۵

اسے نافذ کرنے کی کوشش کی[1] اور اس کی شرح عام روایتی انداز سے ہٹ کر رائج الوقت سکہ کے مطابق امیر، متوسط اور ادنیٰ درجے کے ذمیوں کے لئے بالترتیب ۴۰، ۲۰ اور ۱۰ تنکہ متعین کیا[2] جزیہ کے سلسلہ میں فیروز شاہ کا ایک اہم اقدام یہ بھی تھا کہ اس نے برہمنوں کو بھی اس کی ادائیگی کا پابند قرار دیا جو پہلے کے ادوار میں اس سے مستثنیٰ تھے لیکن یہ بات کہ کس سلطان کے عہد میں برہمنوں کو یہ رعایت دی گئی نہ تو معاصر مورخ عفیف (جنھوں نے فیروز شاہ کے دور میں ان پر جزیہ عائد کئے جانے کا ذکر کیا ہے۔) اس کی وضاحت پیش کر سکے اور نہ دیگر مورخین کے بیانات میں اس کا حوالہ ملتا ہے۔ دوسری جانب یہ بھی قابل غور ہے کہ محمد بن قاسم جس نے سب سے پہلے سندھ کے ہندوؤں پر جزیہ نافذ کیا تھا کے دور میں اس طرح کا کوئی استثناء تاریخی آخذ سے ثابت نہیں ہے جب کہ یہ بخوبی معلوم ہے کہ وہاں کے (مفتوح) باشندوں میں برہمنوں کی اچھی خاصی تعداد بھی شامل تھی۔ بہرحال عفیف کے بیان کے مطابق فیروز شاہ نے سابق ادوار میں برہمنوں کی استثنائی حیثیت پر غور و فکر کے لئے علماء و مشائخ کی ایک مجلس منعقد کی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ برہمنوں کو اپنے ہم مذہبوں میں جو مقام حاصل ہے اور عام معاشرہ میں ان کے جو حالات ہیں ان کو مدنظر رکھا جائے۔ حاضرین مجلس نے یہ متفقہ رائے پیش کی کہ شریعت کی رو سے برہمن اس رعایت کے مستحق نہیں ہیں اس لئے ان پر جزیہ عائد کیا جانا چاہئے۔ فیروز شاہ نے اس فیصلہ کی روشنی میں برہمنوں کی استثنائی حیثیت ختم کر کے ان پر جزیہ عائد کیا اور اس اقدام کے خلاف دہلی کے ہندوؤں کے احتجاج کے باوجود اس فیصلہ میں کوئی تبدیلی نہ کی[3]

---

[1] فتوحات فیروز شاہی ص ۶، ۹، ۱۶، سیرت فیروز شاہی ص ۱۲۵، عفیف، ص ۳۸۲-۲۸۴، برنی (ص ۵۷۴) نے جزیہ و خراج کی ایک ساتھ تحصیل کا ذکر کیا ہے۔ [2] عفیف، ص ۲۸۲-۲۸۴ [3] عفیف (ص ۲۸۲-۲۸۴) کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان کے فیصلہ میں تبدیلی نہ پا کر دہلی کے ہندوؤں نے برہمنوں کی جانب سے جزیہ کی ادائیگی اپنے ذمہ لی اور اس طرح یہ قضیہ تمام ہوا لیکن ایک چیز اور مورخ کی تفصیلات سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ فیروز شاہ سے پہلے بھی جزیہ وصول کیا جاتا تھا اور ہندو آبادی اس محصول سے مانوس تھی اس لئے کہ دہلی کے ہندو نفس جزیہ کے نفاذ پر معترض نہ تھے بلکہ برہمنوں پر جزیہ عائد کئے جانے کے مخالف تھے۔

البتہ جب برہمنوں کے لئے مقدار جزیہ میں تخفیف کی درخواست کی گئی تو سلطان نے اسے منظور کرتے ہوئے ان کے حق میں یکساں طور پر فی نفر پچاس جیتل والے تنکہ سے دس تنکہ مقرر کیا[۱]

فیروز شاہ نے قبل برہمنوں کو جزیہ سے کیوں مستثنیٰ کیا گیا، عفیف کی عدم وضاحت کے سبب اس کا قطعی جواب دینا مشکل ہے۔ بظاہر اس کی تاویل یہی کی جا سکتی ہے کہ انھیں خالص مذہبی طبقہ قرار دے کر یا معابد کے خدام میں شامل کر کے جزیہ سے استثناد کا مستحق قرار دیا گیا ہوگا لیکن عہد فیروز شاہی کے علمار کی بابت یہ قطعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کا فیصلہ اس نکتہ پر مبنی تھا کہ برہمن اپنی سیاسی و سماجی مصروفیات اور معاشی حالات کے لحاظ سے خالص مذہبی طبقہ میں شمار کئے جانے کے قابل نہیں ہیں اور نہ معابد کے ان خدام میں شامل کئے جا سکتے ہیں جن کا گذر بسر نذرانہ و خیرات پر منحصر تھا۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ فقہاء عام طور پر رہبان اور مذہبی پیشواؤں اور عبادت گاہوں کے خادموں کو جزیہ سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ صراحت بھی کرتے ہیں کہ اگر اس طبقہ کے لوگ محض مذہبی امور کی انجام دہی کے لئے وقف نہ ہوں بلکہ معاشرتی زندگی کے دیگر تقاضوں کو بالفعل یا بالقوۃ پورا کرتے ہوں تو یہ جزیہ سے مستثنیٰ نہ کئے جائیں گے، اسی طرح اگر انھیں فراخی حاصل ہو اور ان کا ذریعہ معاش محض خیرات نہ ہو تو بھی یہ جزیہ سے استثناد کے مستحق نہ ہوں گے[۲]

---

[۱] عفیف، ص ۲۸۲، ایک معیاری تنکہ ۴۸ جیتل کے برابر ہوتا تھا۔ پچاس جیتل کا تنکہ اس سے کمتر تھا اس کے مطابق جزیہ عائد کرنا برہمنوں کے حق میں ایک مزید رعایت تھی۔ حنفی مسلک کے مطابق مالی اعتبار سے ذمیوں کو تین طبقوں میں تقسیم کر کے ایک متعین تناسب کے ساتھ جزیہ عائد کیا جائے گا۔ شافعی و مالکی فقہا کے نزدیک مقدار جزیہ کی تعیین امام یا سلطان کی صوابدید پر منحصر ہوگی، امام مالک کے نزدیک جزیہ کی کوئی "اقل" یا "اکثر" مقدار نہیں ہے جب کہ امام شافعی کی رائے میں جزیہ ایک دینار سے کم نہیں ہونا چاہئے بہر حال ان دونوں کے نزدیک ذمیوں کی طبقاتی تقسیم ضروری نہیں ہے اور امام اپنی صوابدید کے مطابق تمام ذمی باشندوں پر جزیہ کی یکساں مقدار بھی عائد کر سکتا ہے (الہدایہ جلد ثانی ص ۵۷۰-۵۷۱، الماوردی ص ۱۲۸)

[۲] الہدایہ جلد ثانی ص ۵۷۵ ابو یوسف، محولہ بالا ص ۲

نظام محاصل میں فیروز شاہ کی اصلاحات کا دوسرا اہم پہلو ان ٹیکسوں کو ممنوع قرار دینا تھا جو اسلام کے معروف محاصل میں شامل نہیں تھے۔ لیکن دہلی سلطنت کے ذرائع آمدنی میں داخل تھے ان میں سے بعض محاصل ممکن ہے مسلم دور حکومت کی پیداوار رہے ہوں لیکن اکثر و بیشتر ہندوستان کی قدیم حکومت کی یادگار تھے[1] فیروز شاہ نے علماء مشائخ و قضاۃ سے ان کی شرعی نوعیت معلوم کی ان کے اس فتویٰ کی روشنی میں کہ یہ تمام غیر مشروع ہیں سلطان نے ان محاصل کی معافی کا اعلان کیا اور ان عمال کو موجب سزا قرار دیا جو ان معاف شدہ ٹیکسوں کی تحصیل کا ذریعہ بنیں[2]۔ عفیف نے فیروز شاہ کے معاف کردہ ٹیکسوں کی تعداد صرف چار بتائی ہے لیکن دیگر مآخذ کی مدد سے ان کی تعداد ۲۹ متعین کی جاسکتی ہے۔ ان کی فہرست[3] پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں زیادہ تر وہ ٹیکس شامل تھے جو شہروں اور قصبوں میں خرید و فروخت کی مختلف اشیاء پر عائد کئے جاتے تھے یا معمولی درجہ کے اہل صنعت و حرفت سے وصول کئے جاتے تھے۔ اسی لئے بعض کتابوں میں ان ٹیکسوں کو مجموعی طور پر "خراج محترفہ" کے نام سے ذکر کیا گیا ہے[4] لیکن ان میں بعض ایسے محاصل بھی تھے جو خالصتہً کسانوں اور دیہات کے لوگوں

---

[1] قدیم ہندوستان کے قانونی و تاریخی آخذ کی مدد سے اس دور میں عائد کئے جانے والے ٹیکسوں کا موازنہ فیروز شاہ کے معاف کردہ محاصل سے کیا جائے تو دونوں کی مماثلت بخوبی واضح ہو جائے گی اس طرح کا ایک مفید مطالعہ دور جدید کے مورخ اشتیاق حسین قریشی نے پیش کیا ہے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ان کی مشہور کتاب "ایڈ منسٹریشن آف سلطنت آف دہلی"، کراچی ۱۹۵۸ء ص ۲۲۶-۲۲۷ [2] فتوحات ص ۵، سیرت فیروز شاہی ص ۱۲۶، عفیف ص ۲۷۸-۲۷۹ فتاوائے فیروز شاہی میں (۲۳۲ ب) ان عمال کو قانوناً شہادت دینے کا نااہل قرار دیا گیا ہے جو غیر شرعی محاصل کی تحصیل میں ملوث ہوں [3] منڈوی برگ، دلالت بازارہا، جزاری، امیری طرب، گل فروشی، جزیہ تنبول، چنگی غلہ، کتابی، نیلگری، ماہی فروشی، ندافی، صابون گری، ریسمان فروشی، روغن گری، نخود بریاں، تہبازاری، چھتہ، قمارخانہ، دادبگی، کوتوالی، قصابی، کوزہ خشت پزی، کرہی، چرائی، مصادرات، خضرات، دانگانہ، دوری اور مستغل۔ ان محاصل کی تشریح و توضیح کے لئے دیکھئے اشتیاق حسین قریشی، محولہ بالا، ص ۲۵۴-۲۵۵ اور پروفیسر خلیق احمد نظامی سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ادارہ ادبیات دلی ۱۹۸۱ء ص ۴۲۱-۴۲۲ [4] انشائے ماہرو، مکتوب ۱۰ نیز دیکھئے دستور الالباب، محولہ بالا، ورق ۳۰ الف، ۳۰ ب، ۲۷ الف، ۲۷ ب

سے تعلق رکھتے تھے مثلاً چرائی (چراگاہ میں جانوروں کے چرانے پر ٹیکس) کرہی (دیہات کے مکانوں پر ٹیکس) وغیرہ۔ اور کچھ ایسے بھی تھے جو سرکاری کام کاج سے منسلک تھے مثلاً کوتوالی، احتسابی، داد بیگی وغیرہ[۱] ان محاصل میں سوائے چند کے باقی تمام کی بابت یہ صراحت نہیں ملتی کہ وہ معاف کئے جانے سے قبل کس شرح کے تحت وصول کئے جاتے تھے اس لئے قطعی طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ فیروز شاہ کے اس اقدام نے دوکانداروں، دستکاروں اور کسانوں کی گراں باری کو کس حد تک کم کیا۔ لیکن اس کا ہلکا سا اندازہ عفیف کے اس بیان سے ملتا ہے کہ غیر شرعی محاصل پر پابندی کی وجہ سے حکومت کو سالانہ تقریباً تیس لاکھ تنکہ کا نقصان ہوتا تھا[۲] فیروز شاہی حکومت کی مجموعی آمدنی میں اس کا تناسب متعین کرنے کے لئے یہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ عفیف ہی کی صراحت کے مطابق اس وقت حکومت کو مختلف محاصل کے ذریعہ سالانہ ۶ کروڑ ۷۵ لاکھ تنکہ کی آمدنی ہوتی تھی[۳] بہر حال اس سے قطع نظر کہ غیر شرعی محاصل کی ممانعت نے متعلقہ لوگوں کے بوجھ کو کس حد تک ہلکا کیا اور حکومت پر اس کے کیا اثرات مترتب ہوئے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس اقدام سے غیر شرعی ذرائع آمدنی پر پابندی[۴] اور عوام کے مختلف طبقوں کی فلاح و بہبود مقصود تھی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ممانعتی احکام کو سختی سے نافذ نہ کرنے کی وجہ سے یا مقامی عملۂ حکومت کے ذاتی منفعت کے سبب ان محاصل کو ختم کرنے کے لئے فیروز شاہ اور دیگر بادشاہوں کی کوشش پوری طرح بار آور نہ ہو سکی۔ اس کا سبب

---

۱ فتوحات فیروز شاہی ص ۵ ۲ عفیف ص ۲۷۹ ۳ عفیف ص ۹۴-۲۹۶ ۴ یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ فیروز شاہ کے معاصر اور مشہور سہروردی بزرگ سید جلال الدین بخاری المعروف بہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے ایک سوال کے جواب میں سلاطین و ملوک کے یہاں کھانا کھانا مکروہ قرار دیا تھا اور اس کی اصل وجہ یہ ظاہر کی تھی کہ ان کی حکومت کے ذرائع آمدنی میں غیر شرعی محاصل بھی شامل ہوتے ہیں اس موقعہ پر موصوف نے اس طرح کے کچھ محاصل کی نشاندہی بھی کی تھی۔ ان محاصل کے نام فہرست میں بھی ملتے ہیں کوئی تعجب نہیں کہ فیروز شاہ ان کے خیالات سے [illegible] اس لئے کہ یہ ثابت ہے کہ سلطان کو ان بزرگ سے خاص عقیدت تھی تفصیل کے لئے دیکھئے سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، محمود بلالہ ۱۲۱۔ ۲۲۷

سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مسلم دورِ حکومت میں متعدد بار اس طرح کے ٹیکسوں کے معاف کئے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ گرچہ مختلف بادشاہوں کے عہد میں یہ معاف شدہ ٹیکس مختلف ناموں سے موسوم کئے گئے ہیں لیکن مجموعی طور پر ان کی نوعیت میں کافی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔

فیروز شاہ کے نظام محاصل کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ ایک جانب اس نے شریعت کے مسلمہ و مقررہ محاصل کے علاوہ باقی تمام پر پابندی عائد کی دوسری جانب علماء کے مشورے سے بعض نئے محاصل عائد کئے اور اس طرح فقہ اسلامی کے اجتہادی پہلو کو نمایاں کیا۔ فیروز شاہ نے رفاہ عام کے بہت سے کام انجام دیئے تھے متعدد نہروں کی تعمیر[1] انھیں کاموں کا ایک حصہ تھی۔ نئے آباد شدہ شہروں میں پانی کی سپلائی کے علاوہ یہ نہریں آبپاشی کے لئے بھی بہت مفید ثابت ہوئیں۔ معاصر مورخین کے بیان کے مطابق ان کی وجہ سے مزروعہ آراضی کی پیداوار میں کافی اضافہ ہوا اور بنجر و بیکار زمینوں کو قابل کاشت بنانے میں بھی مدد ملی[3]۔ فیروز شاہ نے ان نہروں کے ذریعہ آبپاشی کرنے پر کچھ محصول عائد کرنا چاہا اور اس کے لئے علماء و قضاۃ سے مشورہ طلب کیا۔ انھوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ دیا کہ نہروں کی کھدائی میں مال صرف کرنے والا آبپاشی کی سہولت اٹھانے والوں

---

[1] فیروز شاہ کے دور میں تعمیر کی جانے والی بہت سی نہروں میں رفح خانی اور راجیواہ نام کی دو نہریں خاص طور سے قابل ذکر ہیں پہلی دریائے ستلج سے نکالی گئی تھی اور اس کی لمبائی ۴۸ کوس (تقریباً ۹۶ میل) تھی اور دوسری جمنا سے اور یہ دونوں دلی کے قریب فیروز شاہ کے آباد کردہ نئے شہروں فیروز آباد (موجودہ فیروز شاہ کوٹلہ) و حصار فیروزہ سے منسلک تھیں۔ اس موضوع پر تفصیلات کے لئے دیکھئے برنی ص ۵۶۷، عفیف صفحہ ۱۲۷-۱۲۹، یحییٰ بن احمد سرہندی "تاریخ مبارک شاہی" کلکتہ ۱۹۳۱ء، ص ۱۲۵-۱۲۶، ۱۳۰، محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ "تاریخ فرشتہ"، نولکشور، جزو اول، ص ۱۴۶

[2] فتاوائے فیروز شاہی (۲۰۸ ب) میں سرکاری مصارف سے نہروں کی تعمیر پر بعض سوالات و جوابات منقول ہیں۔ [3] برنی و عفیف دونوں اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ ان نہروں کی بدولت زراعت کو ترقی ہوئی اور اس کے فیض سے نہروں کے کنارے بہت سے نئے گاؤں آباد ہوئے اور ان کے آس پاس زمین کا کوئی چپہ کاشت سے خالی نہ تھا (برنی، ص ۵۶۸-۵۷۰، ص ۱۲۹-۱۳۰)

سے "حق شرب"[1] کے طور پر پیداوار کا دسواں حصہ حاصل کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ سلطان نے اس فیصلہ کی روشنی میں "حق شرب" عائد کیا اور اس کی آمدنی کو املاک میں داخل کر کے علماء و مشائخ کی بہبود کے لئے مخصوص قرار دیا[2]۔ بعض جدید مورخین نے فیروز شاہ کے اس اقدام پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ رائے پیش کی ہے کہ سلطان نے ان نہروں کی تعمیر اپنے ذاتی فنڈ سے کرائی تھی اسی لئے ان سے حاصل ہونے والے ٹیکس کو اپنی املاک کا ایک حصہ قرار دیا یہ اور بات ہے کہ اسے علماء کے لئے وقف کیا[3] لیکن کسی واضح ثبوت کے بغیر اور پھر اس دور کے سیاسی ڈھانچہ کی روشنی میں یہ کہنا مشکل ہے کہ سلاطین کی کوئی ذاتی ملکیت یا جائداد ہوتی تھی یا "جیب خاص" کے نام سے ان کا کوئی اپنا فنڈ ہوتا تھا۔

جہاں تک سرکاری نہروں سے آبپاشی پر محصول عائد کرنے کی بابت علماء کی مذکورہ رائے کا تعلق ہے اسلام کے ابتدائی دور میں اس کی کوئی عملی یا قانونی نظیر نہیں ملتی۔ یہ بخوبی معلوم ہے کہ بیت المال کے وسائل سے نہروں کی تعمیر کا سلسلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں شروع ہوا جو بعد میں بھی جاری رہا[4] لیکن ان نہروں سے آبپاشی پر کسی محصول کا ذکر نہیں ملتا بلکہ اس امر سے کہ ان نہروں سے سینچی جانے والی عشری زمینوں کی پیداوار کا دسواں حصہ (عشر) بطور زکوٰۃ وصول کیا جاتا تھا یہ واضح ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ یہ زمینیں آبپاشی کے محصول سے مستثنیٰ تھیں۔ اس لئے کہ محصول عائد کئے جانے کی صورت میں زکوٰۃ کی شرح کل پیداوار کا

---

[1] فقہ کی عام اصطلاح میں ان نہروں سے جو کسی کی ذاتی ملک میں ہوں دوسرے افراد کو خود پانی پینے اور اپنے جانوروں کو پلانے کا جو حق حاصل ہوتا ہے اسے "حق شرب" کہا جاتا ہے۔ مورخ نے یہاں اسے محصولِ آبپاشی یا آبیانہ کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ [2] عفیف، ص ۱۲۹-۱۳۰ [3] دیکھئے اشتیاق حسین قریشی، محولہ بالا، ص ۲۲۱-۲۲۲۔ [4] ابن عبد الحکم، کتاب فتوح مصر و اخبارہا، لیدن، سنہ ۱۹۲۰ء، ص ۱۵۱، ۱۶۳-۱۶۶، احمد بن یحییٰ بلاذری، فتوح البلدان، قاہرہ سنہ ۱۹۳۲ء، ص ۲۵۱-۲۶۴، علامہ شبلی نعمانی، الفاروق، دار المصنفین۔ اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء، حصہ دوم، ص ۷۱-۸۰

بیسواں حصہ (نصف عشر) ہوتی[1]۔ فقہ کے قدیم ماخذ میں نہروں کی تعمیر اور ان سے استفادہ کے حقوق کے مسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے لیکن آبپاشی پر محصول کا کوئی مسئلہ زیر بحث نہیں آیا ہے[2]۔ یہ مسئلہ درحقیقت فقہی نقطۂ نظر سے اہم جزئیہ کے تحت آتا ہے کہ کیا حکومت کو شریعت کے متعینہ محاصل کے علاوہ نئے محاصل عائد کرنے کا اختیار حاصل ہے متعدد فقہاء اور مفکرین اسلام نے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے اور یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگر بیت المال کے معروف وسائل حکومت کی بنیادی ذمہ داریوں کی انجام دہی یا اجتماعی ضروریات کی تکمیل کے لئے ناکافی ہوں تو حکومت اپنے اصحاب ثروت شہریوں سے مزید مال حاصل کرنے یا عوام پر بقدر استطاعت نیا محصول عائد کرنے کی مجاز ہوگی[3]۔ اس میں شبہ نہیں کہ فقہاء نے عام طور پر اجتماعی ضروریات کے ضمن میں کفالتِ عامہ کا اہتمام، جہاد کی تیاری، دفاعی مصارف اور قیدیوں کی

---

[1] اسلام کے قانون محاصل کی رو سے عشری زمین کی سینچائی اگر بارش کے پانی، یا تالاب، دریا و نہر کے ذریعہ بغیر کسی محنت و مصارف برداشت کئے کی جائے تو اس کی پیداوار پر عشر (دسواں حصہ) اور اگر سینچائی میں محنت و مشقت اور مالی مصارف درکار ہوئے ہیں تو اس پر نصف عشر (بیسواں حصہ) واجب الادا ہوگا۔

[2] اسلام کے ابتدائی دور میں اور فقہاء متقدمین کے یہاں اس مسئلہ کے عدم ذکر کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ بنیادی طور پر یہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ بیت المال کے ذرائع آمدنی سے عوام کی فلاح و بہبود کے کام انجام دے اور مستحسن یہی ہے کہ رفاہی کاموں سے استفادہ پر کوئی مالی معاوضہ نہ لے الا آں کہ مزید وسائل کی فراہمی ناگزیر ہو جائے اس دور میں چونکہ بیت المال کو وسعت حاصل رہی اس لئے فکری و عملی طور پر آبپاشی پر محصول کا مسئلہ سامنے نہیں آیا۔

[3] مجموع فتاوی شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ مطابع دار العربیہ بیروت ۱۳۹۸ھ المجلد التاسع والعشرون، ص ۱۸۰، ابن حزم، المحلی، ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر ۱۳۴۹ھ، الجزء السادس، ص ۱۵۶، محمد بن احمد القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، مطبعہ دار الکتب القاہرہ، ۱۹۵۴ء الجزء الثانی، ص ۲۲۳، ابراہیم بن موسی الشاطبی الاعتصام، مطبعۃ المنار، مصر ۱۹۱۳ء، الجزء الثانی، ص ۲۹۵-۲۹۶، محمد بن ابی سہیل السرخسی، المبسوط، مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۲۴ھ الجزء العاشر ص ۲، الماوردی، محولہ بالا، ص ۱۸۹، الہدایہ جلد ثانی ص ۵۲۸، ابن عابدین الشامی رد المحتار علی الدر المختار، دار الطباعۃ المصریہ ۱۲۷۲ھ الجزء الثانی، ص ۵۶-۵۷۔

رہائی کے لئے فدیہ کی ادائیگی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ان "ضروریات" کا دائرہ عوام کی خوشحالی اور ملک کی معاشی تعمیر و ترقی کے کاموں تک بھی وسیع کیا جا سکتا ہے اور ان کی انجام دہی کے لئے نئے محاصل عائد کرنے کے حق میں بھی وہی طرزِ استدلال اختیار کیا جا سکتا ہے[1] جو دفاعی ضروریات کے مسئلہ میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ ملک کا استحکام اور اس کی دفاعی قوت کافی حد تک اس کی معاشی تعمیر و ترقی اور عوام کے اقتصادی حالات کی بہتری سے وابستہ ہے[2]۔ یہاں یہ ذکر اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ فتاوائے فیروز شاہی[3] اور اسی دور میں مکمل کی گئی ایک دوسری کتاب انشاء ماہرو[4] سے قطعی طور پر یہ ثابت ہے کہ حکومت کی جانب سے نئے محاصل عائد کرنے کا مسئلہ عہدِ فیروز شاہی میں کچھ ہندوستانی علماء کے غور و فکر کا موضوع بنا تھا اور اس سے اہم یہ کہ یہ علماء اپنے طرزِ استدلال اور نتائج میں مذکورہ فقہاء سے کچھ مختلف نہ تھے۔ رہا اس "حقِ شرب" کے مسئلہ میں علماء کے بحث و مباحثہ کی تفصیلات نہ ملنے کی وجہ سے یقینی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ اس مسئلہ پر اظہارِ خیال کے وقت علماء کے ذہن میں ملک کی معاشی تعمیر و ترقی کے لئے دہلی سلطنت کے موجودہ ذرائع آمدنی کے عدمِ کفایت اور مزید وسائل کی فراہمی کا پہلو تھا یا کوئی اور لیکن اس سے انکار

---

[1] اس کی جانب اشارہ مشہور سیاسی مفکر ماوردی کے اس خیال سے ملتا ہے کہ شہروں کی فصیل بندی اور مساجد و نہروں کی تعمیر و مرمت کے سلسلہ میں حکومت مقامی باشندوں سے جسمانی و مالی خدمات حاصل کر سکتی ہے بشرطیکہ بیت المال کی موجودہ آمدنی ان مصارف کی متحمل نہ ہو سکے (الاحکام السلطانیہ ص ۲۱۳)

[2] یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ معاشی ترقی کا اہتمام بھی فی نفسہ ریاست کی گوناگوں ذمہ داریوں میں داخل ہے اس لئے خود اس ذمہ داری کی تکمیل میں (خواہ یہ ہنگامی ضرورت میں داخل ہو یا نہ) اگر ریاست کو مزید وسائل درکار ہوں تو نئے محاصل کے ذریعہ یہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ریاست کی معاشی ذمہ داریوں اور اس کے تقاضوں پر محققانہ بحث کے لئے ملاحظہ کیجئے پروفیسر محمد نجات اللہ صدیقی کی معرکۃ الآراء کتاب "اسلام کا نظریۂ ملکیت" مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۷۸ء ص ۳۹۱ - ۴۰۵

[3] فتاوائے فیروز شاہی، محولہ بالا، ورق ۲۱۷ ب - ۲۱۸ الف [4] انشاء ماہرو، محولہ بالا، مکتوب عنوان ۲۰

نہیں کیا جا سکتا کہ نہروں کی تعمیر کے کثیر مصارف ان کی وجہ سے زراعت کی غیر معمولی ترقی اور سرکاری اخراجات سے چلائے جانے والے دیگر مختلف النوع رفاہی ادارے[1] ضرور علماء کے پیش نظر رہے ہوں گے۔

اوپر کی تفصیلات سے فیروز شاہ کے نظام محاصل کے جو پہلو نمایاں ہوتے ہیں ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ ان سے شرعی قوانین کی روشنی میں نظم محاصل کو ترتیب دیا۔ اس شعبہ میں پیشرو سلاطین کے عہد سے جو غیر اسلامی دستور و قوانین رائج تھے ان کو ختم کیا اور شرعی ضوابط کے نفاذ پر زور دیا۔ فیروز شاہ کے یہ اصلاحی اقدامات نظم و نسق اور شریعت میں مطابقت پیدا کرنے کی ایک سنجیدہ کوشش کی نشاندہی کرتے ہیں اور یہ اقدامات اس لحاظ سے نہایت اہمیت کے حامل ہیں کہ یہ اس دور میں ظہور پذیر ہوئے جب کہ معاصر مورخ اور سیاسی مفکر اصول حکمرانی سے متعلق اپنی کتاب "فتاوائی جہانداری" میں اس خیال کی ترجمانی کر رہا تھا کہ اس وقت نظام حکومت شریعت کے مطابق نہیں چلایا جا سکتا۔ فیروز شاہ کی یہ کوشش اور موثر ثابت ہوئی ہوتی اگر اس نے عام نظم و نسق میں نرمی کے بجائے کچھ سختی کا مظاہرہ کیا ہوتا اور حکومت کے کل پرزوں کو مضبوطی کے ساتھ منظم کیا ہوتا۔

فیروز شاہ کی اصلاحات کا دوسرا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ جب اسے شرعی قوانین کے نفاذ کا مسئلہ ہوا اس دور میں رائج غیر شرعی رسم و رواج پر پابندی عائد کرنے کا اس نے علماء کا تعاون حاصل کرنا ضروری سمجھا اور ان کے مشورے کی روشنی ہی میں عملی قدم اٹھایا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نظم و نسق کے نئے مسائل درپیش ہوئے تو اس نے معاصر علماء کی اجتہادی فکر کو بھی دعوت دی اور متعلقہ مسئلہ میں ان کے اجتماعی غور و فکر کے نتیجہ میں جو متفقہ رائے سامنے آئی اسی پر اپنے فیصلہ کی بنیاد رکھی، علماء نے نہ صرف یہ کہ عام مسائل میں شریعت کے نقطۂ نظر کو واضح کیا بلکہ نئے مسائل پر بھی خیال کرتے وقت مجتہدانہ فکر کو بھی استعمال کیا، خود سلطان کے حکم سے مرتب کئے جانے والے فتاوای فیروز شاہی میں مذکور متعدد استفتاء و فتویٰ اسکی شہادت دیتے ہیں۔ اس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ چودہویں صدی عیسوی کے ہندوستان میں علماء کی اجتہادی فکر نہ صرف زندہ تھی بلکہ سرگرم عمل بھی تھی۔

---

[1] فیروز شاہ کے رفاہ عام کے کاموں میں مدارس و مکاتب اور شفاخانوں و مہمان خانوں کی تعمیر، بیروزگاری کے انسداد اور غریب لڑکیوں کی شادی کے انتظام کے لئے مستقل شعبوں کا قیام شامل ہے جن کی تفصیلات ایک علیحدہ مضمون کی طالب ہیں۔